سمندر ناؤ میں



غیاث صدیقی

کمپیوٹرائزڈ کتابت : اسپیڈ پرنٹس

طباعت : اسپیڈ پرنٹس، سعید آباد، حیدرآباد

قیمت : ۸۰ روپیے

ملنے کے پتے:

آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی حیدرآباد

غیاث صدیقی بتوسط امجد صدیقی
مجاہد منزل، کالی کمان (۲۲-۵-۲۴۲)
حیدرآباد نمبر ۵۰۰۰۰۲، اے۔پی بھارت

یہ کتاب اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی مالی اعانت سے شائع کی گئی۔

انتساب

وحید عصر نقاد و شاعر

برادر عزیز پروفیسر ڈاکٹر وحید اختر کے نام

فہرست





غزلیں

تعارف

گونگا درد ، جناب صدیقی کے انشائیوں ، طنزیہ مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ہے ۔ ان میں بلند آہنگ نقارے اور تیز شہنائی کی کیفیت نہیں ، تبسم زیر لب اور آہستہ پھیلتی ہوئی چاندنی کی بہار ہے ، یہی اس مجموعے کی امتیازی صفت ہے ۔ اور یہ صفت بڑی قابل قدر ہے ۔

ہمارے ملک میں غم وغصہ ، رونا بسورنا ، چیخ پکار ، وعظ و پند تو بہت ہے لیکن مہذب انسان کی دوستی جس میں اردگرد کے لوگ ہی نہیں خود اپنی ذات بھی نشانہ نہ ہو کم ہی ملتی ہے ۔ یار لوگ یا تو ایسی طنز پر اتر آتے ہیں ، جو تیزاب بن جاتی ہے ۔ یا ایسے لفظوں کے کھیل پر ، جو مداری کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے ، پر لطف خیال زندگی کے تضادات ، ظاہر و باطن کا فرق ، شخصیت کے اتار چڑھاؤ ، دل چسپ واقعات کے بہاؤ ، زبان کی نکھری ہوئی دل میں گھر کر جانے والی ایسی دلکشی کم ہی نظر آتی ہے ۔

میں نے اس سے پہلے غیاث صدیقی صاحب کا کوئی مضمون نہیں پڑھا ہاں اس دور کی نثر و نظم میں مزاح نگاری کے جو نمونے سامنے آئے ہیں وہ نظر سے گزرے ہیں ، خود حیدرآباد میں زندہ دلان حیدرآباد کا غلغہ ہے

مجھے ان مضامین کو پڑھ کر بہت لطف آیا ۔ غیاث صدیقی اپنی بات

بہت دھیمے لہجے میں شروع کرتے ہیں ۔ جزئیات کی مصوری پر قدرت رکھتے ہیں ۔ ایک ایک اینٹ رکھ کر عمارت بناتے ہیں ، اور مجموعی تاثر یہ ہوتا ہے کہ ایک فن پارہ وجود میں آیا ہے ۔ اس مجموعے میں جہاں استاد، شاعروں کا قبرستان ، سالی، تصنیف کارد عمل ، پڑوسن ، ادبی ڈکٹیٹر ایک شاگرد شاعرہ ، ایک سیماب صفت دانشور اور کلب کی ایک رات' کل نو مضامین ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ ان میں کچھ جانے پہچانے اشخاص ٹائپ ، مناسب رنگ آمیزی کے ساتھ مواد فراہم کرتے ہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ زخم پہنچانا یا زک دینا مقصود نہیں ، تضادات اور عجائبات سے لطف اٹھانا ہے ، غیاث صدیقی کے یہ مضامین پڑھ کر فرحت اللہ بیگ اور پطرس کی لطیف نگارش یاد آتی ہے چلتے چلاتے اور باتوں باتوں میں بڑی نفیس اور گہری طنز بھی کر جاتے ہیں ۔ ملاحظہ کیجئیے:

* " ہندوستانیوں خصوصا دکنیوں کو بچپن سے ہی ماں باپ جو پہلا کام سکھاتے ہیں وہ ظلم سہنا اور صبر کرنا ہے ۔ "
* منافع کا ہر سال تو سالی کے لئے ہوتا ہے ، خسارے کا سال تو ماں باپ کے لئے ہوتا ہے ۔ " سالی لب سوز، لب ریز اور لب بند بھی ہوتی ہے "
* " پکچر نہیں دیکھی، کلب نہیں گئے، ایک مشاعرہ ہی کرا لیا ۔ "
* " محترمہ قطعا مریضہ نہیں بلکہ میں خود نروس بریک ڈاون کا شکار ہوں "
* " بچوں کی استانیوں نے کہیں سایہ دار درخت بن کر کہیں ٹھنڈی

جھیل بن کر لودھی بھائی کی مدد کی ہے "

* " بارہ سال تک میں نے کامنی کوشل کا چہرہ اور ساغر کی کھنک کو ایک ساتھ رکھا تھا لیکن یہ خواب ٹوٹ گیا۔ "

* طنز و مزاح ایک طور پر تلوار کی دھار پر چلنا ہے ۔ ادبی ڈکٹیٹر اچھا خاصہ شروع ہوا تھا، آخر میں غیاث صاحب پٹری سے اتر گئے ہیں ۔ ایک سیماب صفت دانشور کے آخر میں بھی موڈ بدل جاتا ہے ۔ مگر یہ خاکہ ہے اور شخصیت کی دھوپ چھاؤں کو ظاہر کرتا ہے ۔ ہمارے کچھ شعرا کی نفسیات، ترقی پسندی اور جدیدیت کی آویزش، ادب اور صحافت میں اشتہار بازی، پروپگنڈے کی حکومت، غرض غیاث صدیقی نے اس دور کی بہت سی دلچسپ باتوں کو پر لطف انداز میں پیش کر کے ہمارے لئے مسرت اور بصیرت کا بہت کچھ سامان فراہم کیا ہے ۔ ان کے یہاں عشق کی وہ جست نہیں جو سارے مراحل پلک جھپکتے میں طے کردے، بلکہ وہ لطیف اور نرم اور دلکش راگنی ہے، جو رفتہ رفتہ انسانوں کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے ۔ اور وہ اس دلچسپ سفر سے بہت کچھ حاصل کرلیتا ہے ۔

میں غیاث صدیقی صاحب کو اس مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ ادبی حلقوں میں اس کا مناسب خیر مقدم ہوگا ۔

سرسید نگر، علی گڑھ

۶ / فبروری ۱۹۸۲ء

(پروفیسر) آل احمد سرور

دو باتیں

○ - مسز خان مرحومہ صنعت و حرفت کی تربیت میں مہارت رکھتی تھیں - آج بھی ان کی سینکڑوں شاگرد خواتین سارے ہندوستان میں اپنے فنون کی روشنی بکھیر رہی ہیں - غیاث صدیقی کو ان کے داماد کی حیثیت سے میں جانتا ہوں -

○ - ۱۹۵۳ء میں موصوف نے ماہ نامہ " سیوا " میں (جو خود ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا) ایک طنزیہ مضمون " اور - وہ مسکراتی رہیں " لکھا تھا - ماہ نامہ " سیوا " کی مجلس ادارت ، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ، پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ، پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب ، پنڈت ونشی دھر ودیا لنکار صاحب اور جہاں بانو نقوی صاحبہ پر مشتمل تھی -

○ - ۱۹۷۲ء میں ممتاز تلگو شاعر شری شیشندر شرما کی بیس جدید تلگو نظموں کا اردو ترجمہ " نیلم کے پنکھ " شائع ہوا تو ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں ، ڈاکٹر وحید اختر اور شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کو بہت سراہا اور اس کی اشاعت پر غیاث صدیقی کو مبارک باد دی - یہ تخلیقی ترجمہ اشاعت کے ایک سال کے اندر ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا - اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا

۱۹۷۳ء میں غیاث صدیقی کی طبع زاد نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "آواز کا رنگ" شائع ہوا تو آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے انعام دیا۔

○ ۔ ۱۹۷۶ء میں غزلوں اور نظموں پر مشتمل "قفس رنگ" شائع ہوا تو آندھرا پردیش اور اترپردیش کی اردو اکیڈیمیوں نے انعامات دئیے۔

○ ۔ ۱۹۷۸ء میں جناب وہاب عندلیب (لکچرار اردو) نے "غیاث صدیقی شخصیت اور فن" لکھ کر غیاث صدیقی کی شاعرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ موقر نقادوں، ادیبوں اور دانشوروں کے تاثرات، تبصرے اور غیاث صدیقی کی نثر (انشائیہ، طنزومزاح اور تنقید وغیرہ) کے نمونے بھی پیش کیۓ۔

○ ۔ غیاث صدیقی نے "گونگا درد" کے نام سے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین خاکے اور انشائیے لکھے ہیں، اس میں ان کی باغ و بہار تحریریں ہیں ۔ جو صفحہ اول سے آخر تک دل چسپ اور پر لطف ہیں، موضوعات اچھوتے ہیں، نئے نقطہ نظر سے لکھے، نئے اسلوب نگارش سے مزین ہیں

ان کا مزاح زیر لب تبسم ۔ اور ان کا طنز، گلاب کے کانٹوں کی چبھن کا احساس دلاتا ہے ۔ خصوصاً "سالی" اور شاعروں کا قبرستان" ۔ طنز نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ خاص وعام میں بہت بلد مقبولیت کی سند حاصل کرلے گا۔

خواجہ عبدالغفور

ایچ ۔ سی ۔ ایس

غیاث صدیقی نئے عہد کے مسائل اور احساسات کو نئی زبان اور نیا بیان عطا کرنے کی قدرت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی نفاست اور فنی نزاکت کا پورا شعور رکھتے ہیں۔

اس لئے ان کا قلم غزل اور آزاد نظم دونوں میدانوں میں جولانیاں دکھاتا ہے۔ میں نے ان کا کلام پڑھا ہے اور وہ شاعر کی خوش فکری اور خوش بیانی پر شاہد ہے اس میں ایک ذہنی وسعت اور بالیدگی ہے۔ مغربی ادب سے ذوق و شوق نے ان کے فن پر اور بھی جلا کر دی ہے۔ میں ان کے نئے مجموعوں کا منتظر اور ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے چشم براہ ہوں۔

علی سردار جعفری

حیدرآباد

۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۶ء

شمیشندر شرما کی نظموں کا زیر نظر مجموعہ " نیلم کے پنکھ " بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے اس مجموعے میں شرما کی ۲۰ نظمیں، انگریزی ، اردو اور ہندی ترجموں کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں ۔ انگریزی ترجمہ اندرا دھنراج گیر کے زور قلم کا مظہر ہے ۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی نے ان نظموں کو اردو میں منتقل کیا ہے ۔ ترجمہ اور پھر شعر کا ترجمہ درجہ اول کی تخلیقی صلاحیت، شاعرانہ بصیرت اور زبان و بیان پر بھرپور قدرت چاہتا ہے ۔ اور پورے اطمینان کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر غیاث صدیقی نے شیشہ گری کے اس کار نازک کو بڑی خوبی اور سلیقے سے انجام دیا ہے ۔

اختر حسین

غیاث شعر وادب کا بڑا رچا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔ اتفاق سے انھیں استاد داغ کے سلسلۂ جانشینی کے آخری تاجدار اصفی اورنگ آبادی کا تلمذ نصیب ہوا۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ وہ علم معنیٰ وبیان پر غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ سنگلاخ زمین ہوکہ شگفتہ رواں بحریں ہوں کہ ادق ان کی گرفت میں فرق نہیں اتا۔ ان سے زبان کی یا فن کی کوئی اصولی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ کثرت مطالعہ ان کا خاص وصف ہے۔ وہ قدیم اور جدید تمام تحریکوں، روایات اور تجربوں سے باخبر ہیں۔ وہ ہر چمن کے خوشہ چیں ہیں لیکن اپنی انفرادیت سے دستبردار نہیں ہوتے ان کے کلام میں زبان وبیان کی دلآویزی۔ انداز کا بانکپن بھی ہے اور حقیقتوں کا نیا عرفان بھی۔ وہ غزلوں اور نظموں کے لکھنے پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ غم ذات کا نوحہ سناتے ہوے بھی رجائیت ذہنی کو نہیں کھوتے۔ سماجی مسائل کی الجھنوں کا ذکر کرنے سے گھبراتے نہیں۔ وہ نہ صرف آنکھیں کھول کر دنیا دیکھتے ہیں بلکہ مصور کی نظر کا رنگ بھی بھرتے ہیں اور شاعرانہ خوش الحانی سے اس کیفیت کو ادا کرسکتے ہیں۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں جوہری کی سی نظر رکھتے ہیں۔ ان کے موسیقی سے آشنا کان صوتی آہنگ کا لطیف احساس رکھتے ہیں اسی لیے لہجے کی شرافت وشائستگی، آرزو کی مٹھاس، تلخ بات کو بھی گوارا بنادیتی ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ

غیاث صدیقی حیدرآباد کے شعرا میں کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں - وہ کلاسکی اسالیب پر جتنی قدرت رکھتے ہیں انھیں جدید طرز بیان پر بھی اسی قدر عبور حاصل ہے - وہ نظم کہنے کا جیسا سلیقہ رکھتے ہیں، روایت کے احترام کے ساتھ جدید لہجے کو غزل میں سمونے پر بھی ویسے ہی قادر ہیں -

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے ترجمے پر بھی توجہ کی ہے - ترجمے کے میدان میں ان کی کامیابی اس سے ظاہر ہے کہ ان کے ترجموں پر اصل کا گماں گزرتا ہے - وہ شاعر کی روح کے ساتھ اس کے مخصوص لہجے تہذیبی ماحول حتیٰ کہ اس کے نجی علائم کو بھی دیانت اور خلاقیت کے ساتھ ترجمے میں منتقل کرسکتے ہیں - انگریزی، عربی اور تلگو زبانوں سے انھوں نے جو ترجمے کیے ہیں، وہ اس کا ثبوت ہیں -

" قفس رنگ " ان کا تیسرا مجموعہ ہے - اس سے قبل ان کی طبع زاد نظموں غزلوں کا ایک مجموعہ " آواز کا رنگ " اور " نیلم کے پنکھ " تلگو نظموں کا ترجمہ شائع ہوچکا ہے - " قفس رنگ " اپنی غزلوں کی انفرادیت کے لحاظ سے خصوصی توجہ کا مستحق ہے - غیاث صدیقی کی غزلوں میں جو رنگ و آہنگ ہے، وہ جدید ہوتے ہوئے غزلوں کی کلاسیکیت اور تغزل کا ورثہ دار بھی ہے - " آواز کا رنگ " ان کے تخلیقی سفر کا ابتدائیہ تھا تو " قفس رنگ " اردو شاعری، خصوصاً غزل کے امکانات کا روشن اشاریہ ہے -

ڈاکٹر وحید اختر
شعبہء فلسفہ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نیلم کے پنکھ: شیشندر شرما، ترجمہ: غیاث صدیقی

غیاث صدیقی کے تراجم بھی اردو کی نئی شاعری کا مزاج رکھتے ہیں یقین ہے کہ شیشندر شرما کی شاعری میں وہ تمام عناصر کم و بیش موجود ہوں گے جو جدید ہندوستانی شاعری کی امتیازی صفات ہیں ۔ لیکن یہی ترجمے اگر کسی پرانے خیال کے شاعر نے کیے ہوتے تو وہ عناصر دب جاتے یا مسخ ہو جاتے ۔ موجودہ صورت میں ان نظموں کا مطالعہ ایک خوشگوار تجربہ ہے ۔

میرے ذہن کی وادیوں کو سانس لیتے زمردوں کی مانند سر سبز رہنا ہے
(سوغات)

برگ خشک کی مانند بولیاں اڑ رہی ہیں (طوفان)
ایک نازک خواب ہنس کی طرح بہنے لگا ہے (تم)

چاندنی کی کرنوں سے بنا ہوا ہار تاروں کے ہیروں سے بنے ہوئے ہار تیرے منتظر ہیں (شبنم کے موتی)

ان تراجم کو شائع کر کے غیاث صدیقی ہم سب کے شکریے کے مستحق ہو گئے ہیں ۔

شمس الرحمٰن فاروقی

غیاث صدیقی کے کلام کی شائستگی اور مانوس الفاظ سے ان کا لگاؤ فیض و مخدوم کی یاد دلاتا ہے۔ ۱۹۶۸ء تک کے کلام میں یہ کیفیت زیادہ نمایاں ہے لیکن غیاث صدیقی کو فیض و مخدوم کا مقلد نہیں کہہ سکتے، مجموعے میں شامل تین مذہبی نظموں کی مثال (حاکم بدہن، سلام اس پر اور معجزے) میرے اس نتیجے کی تائید کے لئے کافی ہے۔ شاعر جس مذہبی تجربے سے دوچار ہوا ہے وہ اس کے لئے قیمتی ہے لیکن وہ اس تجربے کو ہم پر مسلط نہیں کرتا بلکہ صرف پیش کردیتا ہے۔ گھریلو زندگی کے تجربات و مشاہدات پر مشتمل بعض نظمیں (مثلاً یہ کون منتظر ہے) بہت خوبصورت ہیں، بعض انگریزی مصرعوں / اشعار سے متاثر ہوکر اور ان کے داخلی منظر کو بیان کرنے کے لئے جو نظمیں کہی گئی ہیں، وہ بھی قابل ذکر ہیں۔

(آواز کارنگ)

شمس الرحمن فاروقی

(ماہ نامہ شب خون)

"تم"

ہر بن موپہ رکے چاند وہ پیکر تم ہو
ساغر کیف ہو ، پھولوں کا سمندر تم ہو

ابرود ، ماہئ بے آب ہلالو ، بولو
کس کے پندار نگہبانی کے خنجر تم ہو

ناخنو ، عقدہ کشائی کرو زخم دل کی
کیسے الماس کے ٹکڑوں کا مقدر تم ہو

سطح ساکن نے بنایا تھا مجھے آئینہ
جھیل میں دور سے پھینکا ہوا کنکر تم ہو

دھوپ چبھتی ہے ، مجھے چھاؤں میں جی لینے دو
جس کے سایے میں پڑا ہوں وہ صنوبر تم ہو

خود گر ظلم ہوں ، احسان جفا دل سے قبول
خوف ہے جس کے کرم سے وہ ستم گر تم ہو

آواز کا رنگ: تبصرہ: یوسف ناظم

کتاب کی ضخامت کا کتاب کی وقعت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ ۱۳۶ صفحوں کا یہ مختصر اور خوبصورت مجموعہ ٔ کلام اس لحاظ سے کافی ضخیم ہے کہ اس کے کئی اشعار قاری کے دل ودماغ کو چھولیتے ہیں (جو شعر دل و ماغ کو چھولے اسے اچھا شعر کہا جاتا ہے ۔ اور ایسے شعر کہنے کے لئے شاعر کا معقول اور باصلاحیت ہونا ضروری ہوتا ہے ۔ غیاث صدیقی نے شاعری کو آب زلال کی طرح برتا ہے ۔ وہ اپنی بات ہر ن پیرا ے میں کہنے کی صلاحیت اور سلیقہ رکھتے ہیں ۔ ان کی آزاد نظموں میں بھی وہی گرفت اور قوت ہے جو ان کی مقفیٰ اور مسجع نظموں میں ہے نرم ونازک غزلیں بھی ہیں، حمد اور سلام میں عقیدے اور ارادت ہے تو چھوٹی چھوٹی نظموں میں فکر و فہم اور بلاغت غزل کے بارے میں میں نے کبھی کہیں پڑھا تھا (کیوں کیا میں پڑھتا نہیں) کہ یہ سب سے زیادہ مشکل صنف شاعری ہے اور غزل کہنے کے لئے پانچ سات کڑی شرطوں کی پابندی ضروری ہے مثلاً یہ کہ غزل کی زبان نرم شیریں اور سلیس ہونی چاہئیے ۔ اور یہ کہ جذبات وخیالات کی رکاکت اور انداز بیان کے ابتذال سے پرہیز کرنا چاہیے ۔ اور یہ کہ غزل میں سپردگی اور خود گذاشتگی کا احساس نمایاں ہونا چاہئیے ۔ وغیرہ وغیرہ غزل کو شاید شاعری کی سب سے زیادہ بے ساختہ اور مہذب صنف بھی کہا گیا ہے ۔ اسی لئے حکمائے شاعری

نے سب سے زیادہ احتیاط غزل کے معاملے میں تشخیص کی ہے۔ غیاث صدیقی نے غیر محسوس طریقے پر غزل گوئی کی شرطوں کی سختی سے پابندی کی ہے۔ (وہ خو بھی تو ڈاکٹر ہیں اس لئے انہوں نے غزلوں کی صحت کا خاص خیال رکھا

خیال آیا نہیں چھاؤں میں ٹھہرنے کا
اگرچہ راہ میں کتنے گھنے درخت ملے

ناخنو ! عقدہ کشائی کرو زخم دل کی
کیسے الماس کے ٹکڑوں کا مقدر تم ہو

پیالہ زہر کا پی کر زبان حق کھو لو !
جو مصلحت سے ہے خاموش وہ بھی جھوٹا ہے

کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ کہنا فن کاری ہے آواز کا رنگ کے خالق غیاث صدیقی کو اپنے اور قاری دونوں کے وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہے وہ تضیع اوقات کا فن نہیں جانتے۔

ہم سفر مختصر سی نظم ہے۔

تجھ کو خدا سے مانگ کے میں نے
جیسے سب کچھ مانگ لیا ہے

بظاہر نہایت بے ضرر اور سادہ مصرعے ہیں۔ غالبا یہ بات شیکسپر نے کہی ہے کہ ہر منٹ میں کئی دن ہیں۔ اتنی وزنی تو خیر نہیں لیکن ایسی ہی کوئی

بات اس نظم کے بارے میں کہی جا سکتی ہے اس معصومیت میں سلیقہ ۔ حسن ۔ (یا حسن طلب) اور دینے والے کی داد و دہش کی کتنی ہی ان کہی باتیں بند ہیں (لیکن یہ سب باتیں میں کیوں کہہ رہا ہوں آپ نظم پڑھینگے تو خود ہی محسوس کرینگے) اسی طرح " معجزے " بے حد مختصر لیکن پر شکواہ نظم ہے ۔

غامیں
سانپ کا زہر بھی
آب کوثر بنا
یہ لعاب دہن
تفح خیبرؔ بنا

آواز کا رنگ رواروی میں ہنیں ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کی چیز ہے ۔

نظمیں

حمد



نہ تعدد نہ تسلسل میں ہے عظمت تیری
یہ نقائص ہیں سوا ان سے ہے وحدت تیری

جسم و جوہر نہ جہت یہ ہیں تعین کے نقوش
ہے زماں اور مکاں سے پرے وحدت تیری

لم یلد تیری صفت ہے، تو ولم یولد بھی
خویش کوئی نہیں بس ہے احدیت تیری

کیسا بہروپ، فنا کیسی، کہاں کی حاجت
میرا ایقاں، میرا ایماں، صمدیت تیری

تیرا ابلاغ، فقط احمد بے میم میں ہو
دل کے ہونٹوں پہ رواں ہے احدیت تیری

ایک پتے میں نہاں، دفتر عرفان ہے غیاث
یہی عرفان تو ہے عین شہادت تیری

۱۹۹۰ء

صلی اللہ علیہ وسلم



دنیا پر احسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم
رحمت عالم ، شان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بعد خندق جاں بخشی خزرج کے صیہونی شرکی
کفر پہ یہ احسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

دارالامن کہا اس گھر کو جس گھر میں سازش ہوتی تھی
اللہ رے پیمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ہم دونوں کے ساتھ خدا ہے" غار میں قرآن گونجا ہے
کلمۂ حق ، فرمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

"میرے بعد نبی ہوتا گر تو وہ سراج جنت تھا"
سب نے سنا فرمان محمد صلی اللہ و علیہ و سلم

"ایک غنی نے دل کے ٹکڑے ایک غنی کو بخشے تھے"
جان حیا ہے ، جان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بھائی کے بستر پر بھائی تھا تلواروں کے سائے میں
درس امانت ، جان محمد صلی اللہ و علیہ و سلم

پھر سے مدینے جاؤ غیاث اور درباری کہلاؤ غیاث
بن جاؤ دربان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

۳۰/ ستمبر ۱۹۹۰ء

حواس عشرہ سے کرتے تھے جو طواف علیؑ



یہ بات صاف تھی کہتے تھے صاف صاف علیؑ
خدا کے واسطے کرتے تھے اختلاف علیؑ

حلول کرتے تھے کعبے میں ظاہر و باطن
حواس عشرہ سے کرتے تھے جب طواف علیؑ

یہ نفس کی نہیں، آواز حق کی تھی گویا
شکست خوردہ عدو کو کریں معاف علیؑ

وہ جب بھی پلٹے ہیں، پلٹا خدا محمدؐ کا
کبھی نہ کرتے تھے توہین انحراف علیؑ

کسی کا نفس ہو، اپنا ہو یا ہو بیگانہ
جہاد کرتے تھی ہر نفس کے خلاف علیؑ

خدا کے نور کو پہچان کر، کرے ہے غیاث
علیؑ میں نور محمدؐ کا اعتراف علیؑ

والدہ مرحومہ



کیا تعجب کہ تری یادِ مقدس، اے ماں
میری اشکوں سے اگر کر کے وضو آتی ہے

لبِ اقدس پہ تبسم کے خزانے لے کر
میرے غم خانے میں کس شان سے تو آتی ہے

اپنی بے ساختہ تحریروں سے تقریروں سے
مجھ کو رہ رہ کے ترے دودھ کی بو آتی ہے

جب بھی اپنوں سے میں ہوتا ہوں کرم کا طالب
عطر دانوں سے مجھے غیر کی بو آتی ہے

سوئی بن کر بھی تری یاد جو آتی ہے کبھی
چاک دامن کو میرے کر کے رفو آتی ہے

فکر دنیا سے اُقٹ جاتی ہے جب نیند مری
تیرے دامن کی ہوا لے کے سبو آتی ہے

جب بھی پڑتے ہیں عزیزوں کے تبر سینے پر
کس خموشی سے مرے خواب میں تو آتی ہے

مندمل زخم ہوئے جاتے ہیں آمد سے تری
دل کو تسکین سی ملتی ہے خوشامد سے تری

انیس غم



جواب مانی و بہزاد رشک فردوسی
انیس غم، ترے خامے نے کار تیشہ کیا
تراشے لفظ تو معنی کی آنکھ بھر آئی

درونِ کوہ، وہ دریا کی موج لہرائی
وہ پتھروں کے جگر کاٹ کر نکل آئی
رخِ زمرد و یاقوت پر جمی کائی
ضیائے آب سے ہیرے کی آنکھ پتھرائی

زباں کھولی تو راہیں کھلیں خرد کے لئے
قلم اٹھایا تو مظلوم کی مدد کے لئے

جواب مانی و بہزاد و رشک فردوسی
انیس عز، ترے خامے نے کارتیشہ کیا
تراشے لفظ تو معنٰی کی آنکھ بھر آئی

کبھی جو کھینچ دی تصویر اسپ مشکی کی
فلک پہ ابرسیہ ، ارض پر شب یلدا

پناہ گیسوئے گیتی میں منھ چھپانے لگے

کبھی جو کھینچ لی شمشیر دشت امکان میں
تو دشمنان صداقت شکست کھانے لگے

کبھی جو صبح بہاراں کا عکس پیش کیا
تو عارضوں کے گلاب اور جگمگانے لگے

کبھی جو پانی کو ہونٹوں سے دور کر ڈالا
تو پیاسے ہو کے فرشتے بھی لڑکھڑانے لگے

جواب مانی و بہزاد و رشک فردوسی
انیس غم ، تیرے خامے نے کا رتیشہ کیا
تیراشے لفظ تو معنی کی انکھ بھرآئی

علامہ اقبالؒ کی نذر



آنکھ بھر آئی تھی بربادی گلشن پہ مگر

خار آلودہ نظر صورت گل پوش رہی

دست گل چیں نے جگر چاک کیا پھولوں کا

چیخ ہر گل کی مگر زینت صد گوش رہی

لب اظہار نے کی دل سے بغاوت لیکن

آرزو، آتش خاموش تھی خاموش رہی

زخم دل ، زخم جگر ، زخم نظر لایا ہوں

میں ترے واسطے یہ لعل و گہر لایا ہوں

بے سبب جس کو بہایا گیا ویرانوں میں

سرخیاں جس کی بنیں زیست کے افسانوں میں

جس کو رکھتے تھے زر و سیم کے پیمانوں میں

جس کو مے جان کے پیتے تھے شبستانوں میں

جام یاقوت میں وہ خون جگر لایا ہوں
میں ترے واسطے یہ لعل و گہر لایا ہوں

جس میں جلتے رہے محنت کے پسینے سے چراغ

جس کو دولت نے سمجھ رکھا ہے مجبور کا دل

جس میں شبنم کی شراب اور صبا کے پنکھے

وہی، مظلوم، معصوم کا مزدور کا دل

روکش تاج محل، کانچ کا گھر لایا ہوں
میں ترے واسطے یہ لعل و گہر لایا ہوں

جس میں ہر آنکھ کی ٹھنڈک ہو ہر اک دل کا سکوں
جس میں تہذیب تکلم ہو کہ تقدیس جنوں
جس میں رہتی ہو سدا نکہت کاکل کی طرح
دل انسان کی تمنا دل شاعر کا فسوں

اسی آکاش سے جبریل کے پر لایا ہوں
میں ترے واسطے یہ لعل و گہر لایا ہوں

کتنے معبود بنے ایک پجاری کے لئے
کتنے حلقوم کٹے، نعرہ شاہی کے لئے
اسی تہذیب و تمدن کی نشانی کے لئے
زینت محفل سرمایہ ماضی کے لئے

تیغ افلاس پہ قارون کا سر لایا ہوں
میں ترے واسطے یہ لعل و گہر لایا ہوں

نذر فیض احمد فیض

سر وادی سینا لن ترانی
نہیں بالکل نہیں
جبین پر قطرے محنت کے
جلال و نورِ یزداں
متاعِ علم و فن کا خامۂ انگشت
خون دل میں ڈوبا
زباں زنجیر کے حلقوں میں گویا
گلوئے عشق تک دلاور سن کی نارسائی
تری قامت کا اندازہ ۔۔۔ فلک تک کر نہ پایا

۵ / مئی ۱۹۷۸ء

عروس غزل



رواں تھا بحر عرب پر ترا سفینہ مگر
پسند آ گئے تجھ کو عجم کے دشت و جبل

اداس اداس تھے گلشن، نگر نگر ویراں
برس گئے تری آمد پہ جھوم کر بادل

سر شک میر، زبان ولی، ضیائے سراج
دیار ہند کی محبوب اے عروس غزل

تری نگاہ نے حافظ کے جام چھلکائے
ترے جمال نے سعدی دیا ہے محفل کو

ترا شباب ، تری شوخیاں ، ترے انداز
حیات بخش گئے دل ستان بیدل کو

ترے شعور نے طوفاں میں زندگی دیکھی
دیا پیام سفر خفتگان ، ساحل کو

دیارِ ہند کی محبوب اے عروسِ غزل

چلائے تو نے بصد ناز جو نظر کے تیر
بصد وقار وفا دل پہ انوری نے لیے

جبین زخم پہ قطرات خوں ابھر آئے
درِ خوشِ آب سمجھ کر مہابلی نے لیے

دل حزیں میں ترے درد کو ملا عرفاں
تری زباں کے مزے میر و مصحفی نے لیے

اٹھالیا تجھے نوکِ قلم پہ انشا نے
مزے وصال کے جراءت کی شاعری نے لیے

بنایا تجھ کو گلِ سر سبد جو غالب نے
تو لطفِ شوق کے مومن کی بندگی نے لیے

امیر لے گئے تجھ کو دیار اقدس میں
بنام داغ کچھ الزام مئے کشی نے لیے

شعور عظمت آدم کا تاج پہنا کر
خراج تجھ سے بھی اقبال کی خودی نے لیے

ترے نشاط کے دریا بہائے حسرت نے
گیا ہے فانی ترے یاس کے سفینے لیے

جو پھول بچ گئے اصغر کے دامن دل سے
بفیض ہجر، جگر کی قلندری نے کیے

دیار ہند کی محبوب اے عروس غزل

فراق و فیض و یگانہ نے تیرا نام لیا
غم جہاں ، غم جاناں نے دل کو تھام لیا

قلی کے شہر میں آکر حسین زلفوں کو
سنوارنے کا جلیل و صفی سے کام لیا

ہجوم بادہ گل میں ، ہجوم یاراں میں
نظر جھکائی تو مخدوم کا سلام لیا

بساط ارض دکن ہی سے جھومتا اٹھا
یہ وجد جس کی نگاہوں سے تو نے جام لیا

اریب و شاہد و ساجد نہ میکش و باقی
یہ مئے کدہ ہے یہاں کچھ نہیں بجز ساقی

پرسہ (اپنے نواسے محمد عبدالنعیم سلمہ ،
ابن دخترم اقبال انیسا بیگم نوید مغفورہ کے نام)

ماں اندھیروں میں سوگئی ہے تری
قیمتی چیز کھوگئی ہے تری

آنکھ جو روز شب رہی تجھ پر
آستین بھگو گئی ہے تری

کوئی سایہ بھٹک گیا ہے ترا
کوئی پہچان کھو گئی ہے تری

جہاں جاکر کوئی نہیں لوٹا
ماں اسی شہر کو گئی ہے تری

اب تو ہوگا غیاث بھی بے نام
ماں تو بے نام ہوگئی ہے تری

۵۰

نوید!

دشمنوں سے تو بچ گئی ہے نوید
دوستی کس سے ہوگئی ہے تری

سرخ پھولوں کی فصل اٹھے گی
یاد وہ بیج بوگئی ہے تری

مانگے تانگے کی بے زباں پتوار
ناؤ دل کی ڈبو گئی ہے تری

جہاں ملتے ہیں ہوش کے تحفے
وہیں تقدیر سوگئی ہے تری

پرسہ
(اپنے نواسے محمدؐ عبدالنعیم سلمہ،
ابن دخترم اقبال انیسا بیگم نوید مغفورہ کے نام)

ماں اندھیروں میں سو گئی ہے تری
قیمتی چیز کھو گئی ہے تری

آنکھ جو روز شب رہی تجھ پر
آستینیں بھگو گئی ہے تری

کوئی سایہ بھٹک گیا ہے ترا
کوئی پہچان کھو گئی ہے تری

جہاں جاکر کوئی ہنیں لوٹا
ماں اُسی شہر کو گئی ہے تری

اب تو ہوگا غیاث بھی بے نام
ماں تو بے نام ہو گئی ہے تری

نوید!

دشمنوں سے تو بچ گئی ہے نوید * دوستی کس سے ہو گئی ہے تری
سرخ پھولوں کی فصل اٹھے گی * یاد وہ بیج بو گئی ہے تری
مانگے تانگے کی بے زواں پتوار * ناؤ دل کی ڈبو گئی ہے تری
جہاں ملتے ہیں ہوش کے تحفے * وہیں تقدیر سو گئی ہے تری

نظمیں

جمال مصر



مشرق کی آنکھوں کا تارا
کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا
مغرب کے سفاک دلوں میں
تیل میں آگ بھڑک اُٹھی تھی
خون میں شعلے لپک رہے تھے
لولو کے مرجاں کے ذرے
میدانوں میں بکھر رہے تھے
رشتے ناتے ٹوٹ رہے تھے

نیل یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا

منزل کی پیچیدہ راہیں
گہری سرنگیں، سرخ چٹانیں
سرخ زبانیں مانگ رہی تھیں
کالے بادل اگل رہی تھیں

نیل یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا

بادِ صبا اک جھونکے نے
سارے شعلے بجھا دیے
خون اگلتی شریانوں کے
کٹے پھٹے منھ بند کیے
بادِ صبا کا ایسا جھونکا
کس گلشن کے کنج میں جا کر
شبنم کی چادر کو تانے
کلیوں کے بھیگے بستر پر
بوڑھے سنبل کی
لمبی لمبی نم پلکوں میں
تھک کر آخر لیٹ گیا ہے!!

۲/ جولائی ۱۹۷۲ء

تلاش زر



حسیں بیوی کو، اپنی ننھی بچی کو
بس اک کمرے کے گھر میں
بے سہارا چھوڑ کر
وہ گھر سے نکلا تھا

حسیں چہروں پہ تھوکا
سخی ہاتھوں کو پوجا
شفقت و تقدیس کے ہونٹوں نے
لاکھوں لفظ اگلے
لفظ کیا، بیساکھیاں تھیں
اور وہ، لنگڑی امیدوں کے لئے
منزل نشاں تھیں

سیاسی پرچموں کے نیچے
جانب داریوں کے سدر جوں کی
تیز اور زہریلی کرنیں

سر سے گذریں
اور تلوے چھید کر نکلیں

اور اس کے پاس کیسی نعمتیں تھیں
جوانی، تندرستی، عزم
عصری علم، انساں دوستی
لیکن اُس کے پاس عصری اسلحہ کچھ بھی نہ تھے
کوئی داؤ، کوئی بھی ہتھیار
اس کے ذہن تک پہنچا نہ تھا

جوانی، تندرستی، عزم
عصری علم
انساں دوستی کے کاسے لے کر
گھر سے نکلا تھا
تلاش رزمیں پھرتا تھا
وہ دشت بے حسی میں
جسم کا سونا
گدھوں کی نذر کر کے
اشرف المخلوق ہونے کا
ثبوت بے ریا
پہنچا رہا تھا

گدھوں سے لاش اس کی
پٹ گئی تھی

۱۰/ فروری ۱۹۷۷ء

"پرسہ"



موذن کو دعا دی
آنکھ کھولی
میرے دونوں ہاتھ
دونوں پاؤں
کس نے کاٹ ڈالے
میں تصویر بنا لی بن کے
قطرے خون کے
ڈھونڈا کیا

سامنے تھا واش بیسن
اس کی دونوں ٹونٹیوں سے
خون میرا بہ رہا تھا

شکر کا سجدہ کیا
میں نے اپنے آپ کو پرسہ دیا

۲۴ مارچ ۱۹۷۷ء

ہم لوگ



دکن کے لوگ
کیسے کم سخن ہیں
وفاداری
شر[illegible] استواری
ان [illegible] [illegible] ہے

وہ اپنے ہاتھ کٹو[illegible]
حسیں قاتل کے
دستِ بے ریا کو
چوم لیتے ہیں

۵/اپریل ۱۹۷۷ء

خودکشی



خودکشی
پستول کی گولی سے
خنجر سے بھی ہوتی ہے

مگر کچھ لوگ ایسے ہیں
کسی کا پن چرا کر
نب اڑا کر
مانگ کر کاغذ
سیاہی بھیک میں
احباب سے لے کر

مضامیں
صنعتیں
الفاظ کے پیکر
چبائے لقمے
یا جھوٹے نوالے
دہان مطبع سے
تھوکی ہوی
کچھ منھ چڑاتیں پیشکیں
کمزور شانوں پر اُٹھائے
اپنے ہی کھینچے ہوے
"عظمت کے حلقے" میں اسیر
یا گلے بازی کی
کچھ بیساکھیاں

یا صحافت کی
کوی مدھم لکیر
کیا اکڑ کر
قریہ قریہ پھر رہے تھے

- - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - -

جانب مقتل رواں تھے

ہاتھ ان کا
سینہ ان کا
خنجر ان کا
ہاں، مگر
الزام
سایوں ہی پہ آیا
خودکشی کو قتل ٹھہرایا

۲۵ دسمبر ۱۹۷۸ء

ایر کراش

میرا رشتہ
دھرتی سے جب ٹوٹا
آکاش پہ بادل
میرا سواگت کرنے لگے

میں
بادل کے اوپر
بھی تھا
بادل کے نیچے بھی تھا

کہیں کہیں دریچوں سے
دھرتی بھی نظر آجاتی تھی
بڑے بڑے کھیت
ایسے
گویا گھر کی کیاری بھیگ رہی ہو
بڑے بڑے دولت خانے
گڑیوں کے ہوں کھلونے جیسے

ار ہوسٹیس
پائن آپل کا جوس لے
بل کھاتی
لہراتی آئی
ہونٹوں پر

مسکان کی قیمت
ایر کمپنی رہتی ہے

بریک فاسٹ کے بعد
وہ لمحہ بھی آیا
جب سارے مسافر
اوپر نیچے
دائیں بائیں
ہونے لگے
اسپیکر چیخا
"بلٹ باندھ لو"
سارے چہرے
پیلے پڑنے لگے

جس نے خدا کے
بارے میں
سوچا بھی نہ تھا
وہ بھی

دعا کو

ہاتھ اُٹھائے

آنکھیں

بند کیے اپنے من کے

ہونٹوں سے

اپنے جیون کی

بھیک

مانگ رہا تھا

سارے لاکر

سارے رشتے

ٹوٹ چکے تھے

لیکن ایسے نئے موڑ پر
میں تو خوش تھا
چلو
کفن سے
قبر کے ٹھیکے داروں سے
پیچھا چھوٹا

۱۶/ نومبر ۱۹۷۷ء

شہر آشوب



کئی صدیوں سے
دولت اور حکومت
میرے قدموں میں پڑی تھی

خدا کے فضل سے
بے مائیگی اب ہاتھ آئی ہے

خدا رکھے مجھے محفوظ
لالچ سے
خدائے جہل و دولت کی

خوشامد سے
خیانت کرنے والوں کی
سیاست سے
خدا رکھے محفوظ
دنیا کو دکھانے کی عبادت سے
غریبوں کے لہو کو
چوسنے والوں کی
قربت سے

یہ مالک کارخانے کے
شرابوں کے سگاروں کے

وطن کے نوجوانوں کو

پلا کر زہر

دل ہی دل میں

ہنستے ہیں

کہ سینے میں کسی کے

کینسر کا

پھول کھل جائے

کسی کا پاؤں کٹ جائے

کسی کا قلب رک جائے

زبان مذہب و تہذیب

کے ہتھیار لے کر

زر کے بوتے پر

یہ قوم قاتلاں

دانش گھوں پر بھی
حکومت کر رہی ہے

ادیبوں
شاعروں
دانشوروں کے
قیمتی جلسوں کی
دولت بھی
جہالت بھی
صدارت کر رہی ہے

خدائے عزوجل!
کب تک
یہ آزادی کے پھندے

خدائے لم یزل!
اب تو
ضمیرِ قوم کو ۔۔۔ بیدار کر دے
کٹے ہاتھوں کو ۔۔۔ پھر تلوار کر دے

یکم جنوری ۱۹۸۰ء

سائے دھنک میں کیوں ڈوبے



سلمیٰ
جب کالج میں گئی
تو
ماں کی
مانگ میں
باپ کی مونچھ میں
ہلکی سفیدی
آنے لگی تھی
دونوں نے
سازش کی
لڑکا ڈھونڈا
سلمیٰ کی شادی رچائی

پھر سلمی کے شانوں پر دو ننھی ننھی گڑیاں
کیسے اگ آئیں!

سلمیٰ کے شوہر کو
اوپر سے بلاوا آیا
افق میں اک نغمہ گونجا
وہ نغمے کے پیچھے پیچھے بھاگے
رنگ بن گئے
اور دھنک میں ڈوب گئے

سلمیٰ کے اعصاب کے ساز
بجنے لگے

شوہر، گڑیاں
کپڑے، الماری
گھر، زیور
کچھ بھی اُس کو یاد نہ تھا
کسی نے
اُس کی عمر سے
گویا
پانچ مہینے چرا لیے تھے

ہوش کی کشتی
ساحل سے جب ٹکرائی
سلمیٰ کے
اعصاب کے ساز تھمے

ہونٹوں پر
گڑیوں کے
نام آئے
ذہن کے دروازے سے
کسی نے جھانکا
سلمیٰ
اپنی گڑیوں میں مگن تھی
سلمیٰ کے بابا کو
سلمیٰ کی تنہائی
کھلتی تھی
اک فوجی افسر تھا

اس کے
دو ننھے ننھے لڑکے تھے
اس کی بیوی بھی
اک دن
افق کی اور
چلی گئی تھی

سلمیٰ کے بابا نے
سلمیٰ کے ہاتھوں کو

فوجی افسر کے ہاتھوں میں
تھما دیا تھا
شاید دونوں گھر
بس جائیں
سلمیٰ کو لڑکے
فوجی افسر کو گڑیاں
مل جائیں

افسر کے لڑکوں کو
ماں کا پیار ملا
قریہ قریہ

کوچہ کوچہ
سلمیٰ اُن کو
سینے سے لگائے پھرتی
لیکن
سلمیٰ کی گڑیاں تو
شہر میں
اپنی ماں کی خوشبو کو ترسیں
ایک تبسم عیدی میں بھی
مل نہ سکا
میں
کب سے
یہ سوچ رہا ہوں
سلمیٰ کا

پیدا ہوتا
شانوں پر
گڑیوں کا اگنا
سایوں کا
اُفق میں گم ہو جانا
کیا یہ تماشہ تھا!!

۱۲/ جنوری ۱۹۷۷ء

یاسر عرفات



ہمیں شاہیں ہیں تیرے عہد نو کے

خبر کر، حلقۂ کروبیاں میں

نفس میں شعلے، آنکھوں میں ہے تجلی

کہ سن ہم سے فلسطیں کی زباں میں

جبیں پر خون ہے، خنجر بکف ہیں

نہا کر آئے ہیں آتش فشاں میں

ترے بندے اسیر دشمناں ہیں

زمیں کی داستاں ہے آسماں میں

ہیں تیرے نام لیوا بصد کثرت

مگر وحدت ہے تھوڑی جہاں میں

بہتر ہیں کہ ترے بہشتوں سے

ہزاروں تیر، دست دشمناں میں

تو شمشیر و سناں اول عطا کر

کہ طاؤس و رباب آخر جہاں میں

شہادت ہے مقدر میں ہمارے

فتوح جہاں نصیب دشمناں میں

نگاروں کے شرابوں کے ہیں شیدا

مجاہد تیرے پاکیزہ جہاں میں

شکستیں کھا رہا ہے ، مر رہا ہے
نہیں آتا کوئی دار الاماں میں

ہمیں نان جویں بخشی ہے تو نے
عطا بازوئے حیدرؓ ہو جہاں میں

کہ ہر دل میں فلسطیں پل رہا ہے
تصرف ہو مکاں میں اور زماں میں

مبارک جن کا نام آیا زباں پر
جواب اُن کا کہاں سارے جہاں میں

جولائی ۱۹۸۸ء

دلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب

"دہلی"



مہ و نجوم فرش پر قیامتوں کا شہر ہے
صباحتوں کا شہر ہے، لطافتوں کا شہر ہے
ہیں ہر قدم پہ منزلیں کہ راستے بھی منزلیں
ز شرق تا بہ غرب یہ مسافتوں کا شہر ہے
شمال سے جنوب تک کہانیاں بچھی ہوئیں
یہ دوریوں کا شہر ہے، یہ قربتوں کا شہر ہے
ہیں ہر طرف ہجوم کی گلابیوں میں تازہ گل

دھنک دھنک، کماں کماں یہ نکہتوں کا شہر ہے
حجاب میں تبسموں کے قوس ہیں بجھے بجھے
خموشیوں کا شہر ہے، علامتوں کا شہر ہے
کوی حسین گل بکف، کوی ندیم جاں بکف
محبتوں کا شہر ہے، عداوتوں کا شہر ہے
کئی چراغ بجھ گئے، کئی مکان اُجڑ گئے
نئے مکان بن رہے ہیں عجلتوں کا شہر ہے

گلوں کے زخم ہیں ہرے تو پات پات زرد زرد
ہے فصلِ گل خزاں بکف یہ ضربتوں کا شہر ہے
ہزاروں سال قلب تھا، مگر ہے آج بھی یہ قلب
شہنشہی گذر گئی، وزارتوں کا شہر ہے

ستم کا ہے مشاہدہ، کرم کا ہے مجاہدہ
حکومتوں، وجاہتوں، صلابتوں کا شہر ہے

۱۹۸۲ء

یہ کیسی کہانی ہے

جب انساں پیدا ہوتا ہے
تو روتا ہے
سب ہنستے ہیں خوش ہوتے ہیں

جب مرتا ہے، سب روتے ہیں
یہی زندگی! یہی موت!!

اس وقفے نے
کچھ تحفے دیے ہیں
غرور، ندامت
عزت، ذلت
دولت، غربت
علم، جہالت
سچائی، جھوٹ
قوت، کمزوری

۹۲

اک لمحے تک

سو برسوں تک

زباں ہلانا، سانس بھی لینا

ہاتھوں، پاؤں سے

پہاڑ اٹھانا

موری میں گر کر

اک لمحے میں مرجانا

پیدا کرنے والے کے آگے

جھکنا

یا سب کو

اپنے آگے جھکانا

یہ کیسی کہانی ہے!!!

۱۹ / فبروری ۱۹۹۴ء

احساس وادراک

انگریزی زبان سے

اردو زبان تک

REVIEWER ARE USUALLY PEOPLE WHO
WOULD HAVE BEEN POETS, HISTORIONS,
IF THEY COULD; THEY BIOGRAPHERS,
HAVE TRIED THEIR TALENTS AT ONE OR
THE OTHER AND
HAVE FAILED THEREFORE THEY TURN
CRITICS.

S.T. COLERIDGE.

برساتی نقاد



نظمیں لوہے کی
غزلیں پتھر کی
افسانے بے معنی
اُلٹے سیدھے مضموں لکھے
لنگڑی لولی تقریریں کیں
نادم، نادم
حیراں، حیراں
ناکامی کے بعد ملا ہے
تنقیدوں کا کوچہ

نوکِ قلم پر
نشتر رکھ کر
زخمی رگوں میں
خوں کو ٹٹولا

صرف ندامت ہاتھ آئی ہے
جھوٹی شہرت ہاتھ آئی ہے

یکم جنوری ۱۹۷۱ء

PREJUDICE IS THE CHILD OF IGNORANCE

WILLIUM HAZLITT.

تعصب در بطن جہالت



اک جاہل عورت نے
اک شیطانی کنج میں جاکر
دل کی گہرائی سے مانگی مراد

"اس کی گود ہری ہو جائے"

شب کے ٹھیک بارہ بجے
بجلی کڑکی، بجھے چراغ
رات کے لمبے لمبے
اور بھدے ہاتھوں میں
نوزائیدہ رونے لگا

چوڑا دہانہ، تنگ جبیں
چپٹی ناک اور کالا رنگ
چھوٹا سا صرف ایک کان
بھینگی سی صرف ایک آنکھ
پیٹ بڑا اور چھوٹا سر
کالی کالی لمبی زبان

اس پر بھی
وہ ماں خوش تھی
سوچ سوچ کے رکھا نام

"مسٹر جانب دار"

○

فروری ۱۹۷۱ء

PRACTICE YOURSELF WHAT YOU PREACH.

PLAUTUS.

دیگراں را نصیحت



میں اسکول میں ٹیچر ہوں
بچوں کو روز پڑھاتا ہوں
اچھی باتیں، اچھے کام سکھاتا ہوں

جیسے جھوٹ نہ بولو
لیکن گھر آنے سے پہلے
بار کے بلز
ایک گٹر میں پھینک آتا ہوں

اور اپنی بیوی سے کہتا ہوں
" وعظ کی محفل " سے آیا ہوں

میں اسکول میں ٹیچر ہوں
بچوں کو روز پڑھاتا ہوں
اچھی باتیں ، اچھے کام سکھاتا ہوں
جیسے " دل مت توڑو "
لیکن میں
اچھے خاصے پڑھے لکھے

۱۰۰

نامی، شاعر کو
بھیک میں
کچھ دے دیتا ہوں
اور اسے جاہل کہتا ہوں

میں اسکول میں ٹیچر ہوں
بچوں کو روز پڑھاتا ہوں
اچھی باتیں، اچھے کام سکھاتا ہوں

اچھی نصیحت کرتا ہوں
جیسے نظریں نیچی کر کے چلو

|۵|

میری ایک پڑوسن ہے
بڑی ہٹھیلی، بڑی سجیلی
اُس کے بنگلے کو
تکتے تکتے تھک جاتا ہوں
تب وہ، چوری چوری آکر
مجھ کو تھما دیتی ہے گلوری

مکتب کو تاخیر سے جاتا ہوں
سائن رجسٹر پر کرنے کو
چپراسی کو رشوت دیتا ہوں
کلاس میں داخل ہو کر
نظریں اونچی کر لیتا ہوں
اور اکڑ کر چلتا ہوں
میں اسکول میں ٹیچر ہوں
بچوں کو روز پڑھاتا ہوں
اچھے کام سکھاتا ہوں
اچھی نصیحت کرتا ہوں

مارچ ۱۹۷۱ء

AND THE DEVIL DID GRIN, FOR HIS DARLING SIN, IS PRIDE THAT APES HUMILITY.

S.T. COLERIDGE.

مغرور آدمی ... شیطان سے بھی بڑا



اک شیطان نے دل کو توڑا
اور محبت کو ٹھکرایا
کالی رات میں
نیکی سے منہ کالا کر کے
غیبت کر کے
جھوٹ اُڑا کے
منصور کو قتل کرا کے

عزت لوٹ کے
ڈاکے ڈال کے
جب اپنے گھر پہنچا ہے
سامنے اک مغرور کھڑا تھا
جیسے بے دم کا بندر
اُس کا غرور کس شئے پر تھا
اللہ جانے
علم، حکومت
دولت، قوت

حسن عبادت
حسن سیاست پر
اُس کے آگے
جھک گیا شیطان
ناک گھِسی
اور کان بھی پکڑے
مان لیا
اپنے سے عظیم
اپنے سے اعلیٰ

مارچ ۱۹۷۱ء

HE PRAYETH WELL, WHO LOVETH WELL,
BOTH MAN AND BIRD AND BEAST,
HE PRAYETH BEST, WHO LOVETH BEST
ALL THINGS BOTH GREAT AND SAMLL;
FOR THE DEAR
GOD, WHO LOVETH US, HE MADE AND
LOVETH ALL.
S.T. COLERIDGE.

جیسی محبت ویسی عبادت



میں جب. تجھ پر مرتا ہوں
تیرے سامنے جھکتا ہوں
دل میں اپنے سمجھتا ہوں
تیرا خالق
میرا معبود اور مرا مسجود

میرے سامنے ہے موجود
سب سے زیادہ مجھے عزیز
وہ خالق سارے عالم کا
وہ عاشق سارے عالم کا

سارے انساں، سارے حیواں
ساری بیلیں، سارے پودے
مثبت منفی
منفی مثبت،
تخلیقی مظہر

محوِ تقرب، محوِ عبادت
جیسی عبادت ویسی محبت
جتنی محبت، اتنی عبادت

صرف محبت
صرف عبادت
صرف عبادت

۱۹۷۲ء

MEMORIES - MEMORIES INNUMERABLE

MISS LEENA MEHRA (FILM DIRECTOR)

ان گنت یادیں



یادیں، یادیں
کتنی یادیں
لہروں کی مانند جھپٹتی
آگے بڑھتی
جیسے پیچھے سے اک کوندا لپکے
جانے ان جانے
حال و ماضی میں در آئے

وقت استادہ ہے

اور جامد ہے
سحر آگیں مکڑی کے جالے میں
بکھرا ہے

بے شک یہ یادیں
مدھم بھی پڑ جاتی ہیں
اور ماضی بھی
انجان سا بن جاتا ہے
ایسے میں
پھر نئی زندگی
آنکھیں کھول کے آگے دیکھتی ہے

○

DEFFIANCE OF SECLUDED SELF

MISS LEENA MEHRA

حریفِ تنہائی

اک ایسا وقت آیا تھا
کہ میں سارے نقابوں کو ہٹا کر
اپنی روح عریاں لے کر
بس
تمھارے رو.برو
تنہا کھڑی تھی
نہ ہونٹوں پر تبسم تھا
نہ پلکوں پر ستارے تھے
یہ دل کی آرزو تھی
میں

تمھارے سامنے "میں" بن کے آؤں
میرے "میں" بننے کے
تم بن جاؤ شاہد
مگر تم بن گئے تھے غیر شاید

مجھ سے
آنکھیں پھیر لی تھیں
اور تم
ہنستے رہے

نہیں ہے تم پہ کچھ الزام میرا
کہ تم نے کیوں کیا ایسا
جو کچھ میں نے کیا
اس پر مجھے افسوس ہے

لیا ہے ایک پردے کا سہارا، پھر سے میں نے
تبسم اوڑھ کر پھر آکھڑی ہوں
اگر تم دیکھ سکتے ہو
تو میری سمت دیکھو

کہ میں نے درد کی دیوار میں
بے شک
کھلا چھوڑا نہیں
اک بھی دریچہ

نذر

چیک پوئٹ MIROSLOV HOLEB



گیانی دنیا پھر سے گونج رہی ہے
جیسے بدھا کی چندیا
اور اُس کے پیچھے
جل سانپ کی چکنی کھال کی مانند
دھرتی گویا رینگ رہی ہے
گھر کے باہر
اندھیارے کی "ٹک ٹک"
صاف سنی جائے ہے
ایسے میں '
آکاش سے

کالے آنسو کا قطرہ ٹپکے ہے
اعلان کرے ہے
" میں بھی ایک قیامت ہوں "
چاندنی رات
اک ایسی پستک ہے
جس کے صفحے
لفظوں کو نگل کر
سفید ہو گئے ہیں

اک کتا
پانی میں سے
اپنا عکس
جبڑوں میں پکڑ کر
بھاگے ہے،

اور امن
آئینے کی سطح سمان
اٹل بھی تھا
پرسکوں بھی تھا

دل کے زخموں سے اک چیخ
ہارن جیسی نکل پڑی
جیسے کروکشیتر میں
پانڈو کے معصوم پتر کی آواز
بجھ گئی ہو
"ہم کو لہو دو، ہم آزادی دیں گے"
یہی شبد تو
ذہنوں میں آدرش بن گئے
یہ وہی ویر تھا

جس نے وطن کو آزادی، دی تھی
تم سمجھے؟
دنیا میں اسی کا نام ہے سکھ
لیکن یہ تو
خالی کمرے میں
فون کی گھنٹی کی ہے گونج
سکھ کا مطلب سمجھنے والی دنیا کی

نذر ہے
یہ نظم مری

۲۴ نومبر ۱۹۷۷ء

۱۔ مرے تلووں میں بھی آنکھیں لگی ہیں۔

۲۔ جیت کا فرشتہ بھی مات اوڑھ کر نکلا۔

۳۔ تبسم ملا اُن کو پھینکا ہوا۔

۴۔ شاخِ گل بن گئی گلشن کی صدا آخرِ شب۔

۵۔ دوست تو اک نادان بہت ہے۔

۶۔ اک ابد تک ہیں، مسلسل ازلوں کو دیکھو۔

۷۔ شاخِ گل سے تو ہزاروں لب و رخسار گرے۔

۸۔ کتنی ٹھنڈی لگی پرائی آگ۔

۹۔ زخم دھونے کے لئے دستِ تہ سنگ نکال۔

۱۰۔ نعمتیں ساری ہیں تیار، ذرا ایک دو آنچ

۱۱۔ گفتگو کا کبھی چنگاری سے آغاز نہ ہو

۱۲۔ میں شاعر ہوں تیرا، نہ مرزا نہ میر

۱۳۔ خوف نشاط ہے کہ تبسم گزیدہ ہوں

۱۴۔ ایک شمشیر مرے پہلو سے بچ کر نکلی

۱۵۔ بجا ہو تو قاتل کا سر کاٹ دینا

۱۶۔ وہ بھی اک جان نبی تھا کہ شہادت چومی

۱۷۔ تری گلی میں بھی گرنے کے کچھ سہارے تھے

۱۸۔ اک کہانی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر گئی

۱۹ ۔ میں آندھیوں میں دیپ جلاتا رہا، میاں

۲۰ ۔ اک کانٹا مرے دل میں چبھونے کے لئے آ

۲۱ ۔ وہ غار اپنی ہی لاشوں سے پٹ گئے ہوں گے

۲۲ ۔ لوگ چہروں سے گذر کر بھی نہیں ملتے ہیں

۲۳ ۔ بوجھ احسان کا، پلکوں پہ اُٹھانے والے

۲۴ ۔ آج پلکوں پہ نگر، سلسلۂ دل دیکھا

۲۵ ۔ سب پھیکے پڑ گئے ہیں، تبسم کے سامنے

۲۶ ۔ غم بھی کس وقت گھس آئے ہے مرے کمرے میں

۲۷ ۔ تم کو دل سے دعا دی میں نے

غزل

مجھے تم تپتے صحرا میں نہ چھوڑو
مرے تلووں میں بھی آنکھیں لگی ہیں

غزل



تیری گلی بھی بھلا دی میں نے
کیا تہذیب مٹا دی میں نے

جرم تو آپ نے دل سے کیا ہے
دل کی بات بتا دی میں نے

سب کی سننا دل کی کہنا
اس میں عمر گنوا دی میں نے

جو وہ کہے گا سچ ہی کہے گا
کیسی چیز پلا دی میں نے

تم سے محبت پہلے بھی تھی
سچی بات بتادی، میں نے

اک الزام تم اور لگادو
تم کو دل سے دعا دی میں نے

مفت میں جس نے اکڑنا چاہا
اس کی شان بڑھادی میں نے

چھوٹا پاپ ہے، رہنے بھی دو
اک چلمن تو گرادی میں نے

روز غیاث سے وہ کہتا ہے
کتنی خریدی، کھادی میں نے!

غزل



دلِ و جاں کی وفائیں نذر کی ہیں
وطن میں اپنے پھر بھی اجنبی ہیں

مجھے تم تپتے صحرا میں نہ چھوڑو
مرے تلوؤں میں بھی آنکھیں لگی ہیں

جنھیں بویا تھا پرکھوں نے ہمارے
وہ فصلیں ماہتابوں میں کھڑی ہیں

سمٹ کر ایک دن طوفاں بنیں گی
وہ باہنیں جو لب دریا پڑی ہیں

گھٹاؤں سے بھی اب ڈرنے لگا ہوں
مجھے راتیں بہت ڈستی رہی ہیں

غیاث اپنی کوئی پہچان ڈھونڈے
غزل کو ہم نے بھی تصویریں دی ہیں

میئے کدے سے ہر چہرہ ذات اوڑھ کر نکلا
دن کی باری جب آئی رات اوڑھ کر نکلا

شرط کیا تھی کوچہ بھی کس کا تھا خدا جانے
جیت کا فرشتہ بھی مات اوڑھ کر نکلا

بے کسی کے صحرا میں ، میرا رینگتا سایہ
چاند کا کفن میرے ساتھ اوڑھکر نکلا

برگِ گل میں چھپتا تھا خاربن کے چبھتا تھا
آج دل کا ہر شکوہ بات اوڑھ کر نکلا

۱۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء

غزل



پشیماں ہوئے وہ ، میں ان کا ہوا
تو یہ حادثہ بھی پرانا ہوا

میں ہر لب پہ ہر آنکھ میں ہو گیا
برا ہو گیا میں سو اچھا ہوا

قناعت لبادوں میں ہل چل مچی
تبسم ملا اُن کو پھیکا ہوا

سخاوت کو اُٹھے تھے اپنے ہی ہاتھ
ہمارا ہی دامن تھا پھیلا ہوا

ملے دست ویاذہن سے ، قلب سے
رواں قافلہ آدمی کا ہوا

دو آبے کے ہیں باندھ ٹوٹے ہوئے
کہیں صحن دل میں دھماکا ہوا

غیاث ایسے حق گو کو دیکھو ذرا
سردار ، سراس کا لٹکا ہوا

۲۰ فبروری ۱۹۷۸ء

غزل

نذر مخدوم



کوئی پیغام تمھارا نہ ملا آخر شب
تیز چلتی ہے ، سنا ، روز ہوا آخر شب

رنگ و نکہت نے دعا کی کہ زباں دے یارب
شاخ گل بن گئی ، گلشن کی صدا آخر شب

تیشہ اُٹھا نہ کسی آنکھ سے آنسو ٹپکا
سامنے جلتا رہا شہر وفا آخرشب

اک پر اسرار کہانی کا دیا ہو جیسے
تیری دہلیز پہ نقش کف پا آخر شب

جب حقیقت کو بھی سورج نے نہیں پہچانا
اوڑھ کر آئی تصنع کی ردا آخر شب

کانپتے ہونٹ ، کھلے بال ، چھلکتی شب ماہ
اُٹھ گئے کس کے لئے دست دعا آخر شب

جس میں اک حسرت دیدار قدم بستہ تھی
اُسی کوچے میں غیاث آج ملا آخر شب

یکم فبروری ۱۹۷۸ء

غزل



جینے کا ارمان بہت ہے
یہ مشکل آساں بہت ہے

کل تک جو سایہ تھا میرا
آج وہی انجان بہت ہے

دانا دشمن کتنے ہوں گے
دوست تو اک نادان بہت ہے

لاکھ فرشتے لب بن جائیں
دل میں اک شیطان بہت ہے

اک دن سب انسان بنیں گے
اس دن کا اعلان بہت ہے

علم سمندر ، شاعر قطرہ
اس دعوے میں جاں بہت ہے

خود کو بھی پہچان غیثوا
ہیروں کی پہچان بہت ہے

غزل



کیا بہار آئی ہے پھولوں کو پھلوں کو دیکھو
صاجبو ! شعلہ رخوں ، ہاتھ جلوں کو دیکھو

کیسے کیسے اُفقوں میں تجھے دیکھا ، پھر کیا
اک ابد تک ہیں مسلسل ازلوں کو دیکھو

آج انسان کی تصویر بنانی ہو اگر
کارخانے میں مشینوں کی کلوں کو دیکھو

کوئی پیاسا ہے دم نزع خبر کیا اُن کو
ٹوٹ کے بہہ گئے پانی کے نلوں کو دیکھو

کتنی صدیوں میں بسا سانس کا یہ شہر غیاث
ایک لمحے میں ہزاروں اجلوں کو دیکھو

غزل



فاصلے کم ہوں ، شکایات کا بازار گرے
رات کی رات جو اُٹھی ہے وہ دیوار گرے

بات جب ہے کہ غریبوں کو بھی مسند مل جائے
کوئی سرکار اُٹھے یا کوئی سرکار گرے

کچھ بھی بک جائے مگر ایسا مقام آجائے
بیچنے والے کی نظروں میں خریدار گرے

ہم تو میخانے میں مدہوش تھے لیکن کچھ لوگ
حرم و دیر سے اٹھے ، سر بازار گرے

تیری قامت پہ نہ ٹوٹی کسی ڈالی کی کمر
شاخِ گل سے تو ہزاروں لب و رخسار گرے

ہم بہاروں میں بھی زخمی نہ ہوے حیف غیاث
شاخِ گل کوئی تو ٹوٹے ، کوئی تلوار گرے

غزل



اس نے دل کی بھی یوں بجھائی آگ
شام سے صبح تک لگائی آگ

میرے مرنے پہ کوئی ہنستا تھا
کتنی ٹھنڈی لگی پرائی آگ

ہم نے چھڑکا تھا آگ پر پانی
تم نے پانی پہ بھی بجھائی آگ

اشک امڈے، بجھا نہ دل کا الاؤ
پانی بویا مگر اگ آئی آگ

کیسا الٹا زمانہ آیا غیاث
ہاتھ پیغمبری کے آئی آگ

غزل



دھیما دھیما نیا لہجہ ، نیا آہنگ نکال
تو ، غزل کہنے کو اک قافیۂ تنگ نکال

چشم مجبور کی صورت نہ کبھی دیکھ مجھے
زخم دھونے کے لئے دست تہ سنگ نکال

زرد چہرے پہ ترے ، مجھ کو ، ترس آتا ہے
آئینہ دیکھ لے ، پھر آرزو جنگ نکال

چشم بینا کے لئے ہو شرر لالہ و گل
قلم ایجاد ! تو احساس کا وہ رنگ نکال

روشنی قلب میں ہو ، ذہن میں شعلے لپکیں
اک نئی شمع جلا ، اک نیا مردھنگ نکال

تیکھے لہجے کو نئی نسل سے تو چھین کے دیکھ
روشنی مہر سے تو لنگ نکال

ٹھنڈک بھی آتش سیال سے کیا کم ہے غیاث
بارش سنگ میں اک ہمسر ہوشنگ نکال

غزل

تم بھی جل جاؤ گے اک دن نہ بجھے آج جو آنچ
جو بھی کہنا ہو کہو ، خوف ہی کیا ، سانچ کو آنچ

پلکیں نم ہوگئیں ، کچھ دل بھی دکھادو یارو
پانی ٹھنڈا ہے ، خدا کے لئے کچھ اور دو آنچ

جنت مے کدہ چھوڑو نہ ابھی آے رندو
نعمتیں ساری ہیں تیار ، ذرا ایک دو آنچ

تیری قدرت کا توازن ہے یہ ، نقاش ازل
کوئی تصویر ہو پانی ، کوئی تصویر ہو آنچ

ابدی حسن بنادیتے ہیں لمحات کبھی
دل کو غم ، آنکھ کو منظر ، کسی تحریر کو آنچ

برف دانوں میں ملے ، دوست بھی دشمن بھی غیاث
کتنے ہونٹوں پہ ملی ، من میں سلگتی ہے جو آنچ

غزل



کوئی دم ساز نہ ہو کوئی بھی ہم راز نہ ہو
تیرے کوچے میں مرے رنگ کی آواز نہ ہو

مشورہ شہر کے مقتل میں ملا ہے مجھ کو
خون اگلے مری شہ رگ ، مگر آواز نہ ہو

تیزی پنجہ و منقار بجا ہے ، شاہین !
تیری پرواز کہیں تہمت پرواز نہ ہو

صرف شعلے ہوں ، حنا کے ، تجھے حلقوں میں لیے
نغمگی رنگ کی صورت ہو کوئی ساز نہ ہو

قلب میں ذہن میں ہوتے ہیں مکاں ریشم کے
گفتگو کا کبھی چنگاری سے آغاز نہ ہو

تیری قسمت میں کہاں دارورسن کی رفعت
دوست کہتے ہیں غیاث اب بھی سرافرازنہ ہو

غزل



میں شاعر ہوں تیرا ، نہ مرزا نہ میر
مگر تو علی کل شی قدیر

یہ قلب غنی ہے سوالی ترا
مثال امیر و مثال فقیر

چکا چوند کیوں ہیں مرے ذہن و قلب
ہتھیلی میں گویا ، نئی اک لکیر

ملاحت ، ملاحت ، ملاحت حضور
نہ کالک توے کی ، نہ بدر منیر

کہیں راز افشانہ ہوائے غیاث
کہ پلکوں تک آیا ہے دل کا سفیر

غزل



میں تیری ہر صفت ہوں ، ترا آفریدہ ہوں
کیا رنگ رخ ہوں میں کہ ازل سے پریدہ ہوں

تیغ عدو ، ستائش احباب سے ہے خوب
سن گوش دوست ، زہر غم جاں چشیدہ ہوں

لخت جگر مرا ، سر مژگاں نہ رک سکا
اے آسمان پیر ، جواں مرگ دیدہ ہوں

یک سود و صد زیاں کا حساب آج تک بھی ہے
خوف نشاط ہے کہ تبسم گزیدہ ہوں

مضموں صرف آپ ہیں ، عنواں الگ الگ
میں منقبت ہوں ، نعت ہوں ، حمدوقصیدہ ہوں

ماضی کے ہر خسیس سے طالب تھا مہر کا
حاتم سے آج کے تو میں دامن کشیدہ ہوں

میں زخم تھا تو آپ نمک تھے کبھی غیاث
پہچانا آپ نے وہی آفت رسیدہ ہوں

غزل



ایک قیامت سر آئینہ تو ٹکر نکلی
آنکھ کی پتلی سے اک چیخ برابر نکلی

روکنے والی ، بتادے تجھے مجبوب ہے کیا
تیری دہلیز سے پوچھا تو وہ ٹھوکر نکلی

ڈوبتا جاتا ہے دل ، غم کے اندھیروں میں کہیں
وسعت قطرہ بھی پلکوں پہ سمندر نکلی

یہ دوآبہ مجھے دنیا سے اٹھالیتا ہے
آرزو میری ، تری آنکھوں میں سوکر نکلی

رخ روشن کے ، گھنی زلفوں کے آگے کیا ہے
رات بھی کاسہ بکف ، صبح گداگر نکلی

ہائے میلہ نہ تھا یہ شوق کا مقتل تھا غیاث
ایک شمشیر مرے پہلو سے بچ کر نکلی

غزل



اگر کاٹ دینا مگر کاٹ دینا
بجا ہو تو ، قاتل کا سر کاٹ دینا

جہاں سر اٹھا کر چلے فن کا جادو
وہیں اس کا دست ہنر کاٹ دینا

نہ آسودگی ذہن کو ہے نہ دل کو
یہ عمر خضر دربدر کاٹ دینا

فضا میں بھی دریائے خوں جو بہادے
اس افواہ کے بال و پر کاٹ دینا

جو ہوشامل نفس ، تنقید ، اے دل
تو تاویل کی وہ سپر کاٹ دینا

گلوں کی رسائی نہ ہو نکہتوں تک
تو کلیوں کی شاخ سفر کاٹ دینا

مرا اعتراف آج دشمن کو پہنچے
جو روکے اُسے نامہ بر ، کاٹ دینا

غزل



دل کے ہونٹوں نے اگر درد کی لذت چومی
دہن زخم پہ ہم نے بھی محبت چومی

سیم و زر چھوڑ کے فاقوں کی صلابت چومی
وہ بھی اک جان نبیؐ تھا کہ شہادت چومی

کر دیے وقف ، رہ حق میں حواس عشرہ
سنگ اسود کو بھی چوما تو ہدایت چومی

میں کہاں ، نرغۂ اعداء سے نکل آنا کہاں
کسی تدبر نے بڑھ کر مری قسمت چومی

اپنے پرکھوں سے ملی دولت ادراک ہمیں
پھول پر جنگ تو خنجر پہ صلابت چومی

یاگلابوں پہ سحر ٹوٹ کے برسی ہوگی
یا صبا نے ترے چہرے پہ صباحت چومی

سر سبد چہرے پہ معصوم سی بھیگی آنکھیں
آج پھر مری بصیرت نے بصارت چومی

اُسی دہلیز کی ٹھوکر ، تری قسمت تھی غیاث
لب جدت نے بھی تہذیب قدامت چومی

غزل



نہ بحر و بر تھے نہ افلاک کے کنارے تھے
جہاں حیات کے ہم نے لباس اتارے تھے

زباں کھلی تو لہو چاٹنے لگے خنجر
دلوں میں صرف شہادت کے استعارے تھے

گراتا منعم مہتاب چاندنی کے ورق
سفینے ہنس کے ، جب جھیل میں اتارے تھے

رکھی ہوئی تھی جب افتادگی ہی قسمت میں
تری گلی میں بھی گرنے کے کچھ سہارے تھے

زمیں کے چاند تھے منڈووں کے سائے اوڑھے ہوئے
گلوں سے اڑتے شرارے بھی کتنے پیارے تھے

یکم ڈسمبر ١٩٨٨ء

غزل



آنسوؤں میں بہہ گئی یا سسکیوں میں مر گئی
اک کہانی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر گئی

ایک موتی کے لئے آنکھیں ترستی تھیں کبھی
یاد تیری اس طرح آئی ، کہ پلکیں بھر گئی

صبر ایوبی کو میرے ناپنے کے واسطے
اک مصیبت دندنا کر آئی تھی رو کر گئی

(نذر جوش ملیح آبادی)

آب کیسی ، نرخ کیسا ، موتیوں کا کیا سوال
اک طرف سے ریت اٹھی ، ہر صدف کو بھر گئی

چاندنی میں زلف کے جب سانپ لہرانے لگے
اپنے ہی سائے سے شاخِ گل ، چمن میں ڈر گئی

غزل



احسان کرکے میں تو گناتا رہا میاں
اندھوں کو آئینوں سے بچاتا رہا میاں

اپنے شعورو فکر کو پہنائے اس نے تاج
جو شخص اقتدار پہ آتا رہا میاں

بونا قد آوروں سے ہنر سیکھتا گیا
پھر اس کو اُنگلیوں پہ نچاتا رہ میاں

بہرے پڑے رہے وہیں دامان کوہ میں
میں پربتوں پہ گیت لٹاتا رہا میاں

سچ بولنا جہاں میں کٹھن کام ہے مگر
میں آندھیوں میں دیپ جلاتا رہا میاں

شاید کسی نے مانگا تھا جینے کا حق غیاث
شاخوں پہ زندہ لاشیں اٹھاتا رہا میاں

غزل



اے یاد ، مری پلکوں میں سونے کے لئے آ
بادل کی طرح مجھ کو بھگونے کے لئے آ

میں رو نہ سکا اپنی شکستوں پہ ازل سے
اے دوست ، مری لاش پہ رونے کے لئے آ

اے شعلہ بدن ! جو تری دوری سے لگا تھا
دامن کے اُسی داغ کو دھونے کے لئے آ

جو چاند کی کرنوں نے پیے تھے ترے لب سے
وہ لمحے مرے دل میں سمونے کے لئے آ

میں موم ہوں ، اے رشکِ مہ و آتشِ سیال
پانے کے لئے جا ، مجھے کھونے کے لئے آ

جی اوب گیا جینے سے اے جانِ غیاث آج
اک کانٹا مرے دل میں چبھونے کے لئے آ

یکم جنوری ۱۹۷۷ء

غزل



یہ سچ ہے راہ صداقت سے ہٹ گئے ہوں گے
وہ قتل کر کے ہمیں ، دل میں کٹ گئے ہوں گے

شجر گھنا تھا مگر اڑگیا فضاؤں میں
ہوا کے دوش سے پتے لپٹ گئے ہوں گے

وہ روسیاہ تھا پہنچا در ندامت تک
یہ اہل خیر تھے خانوں میں بٹ گئے ہوں گے

خدا کے واسطے ناکام جانئے نہ انھیں
وہ چھو کے آپ کی منزل پلٹ گئے ہوں گے

دلوں میں شکوؤں کے پتھر اُٹھاکے لائے تھے
وہ بھیگی پلکوں کے تیشوں سے کٹ گئے ہوں گے

حسد کے غار دلوں میں تھے اے ضمیر خطا
وہ غار اپنی ہی لاشوں سے پٹ گئے ہوں گے

ہر ایک قطرے پہ یاقوت کا گماں تھا غیاث
ان آنسوؤں میں سمندر سمٹ گئے ہوں گے

یکم مارچ ۱۹۷۷ء

غزل



لوگ چہروں سے گذر کر بھی ہنیں ملنتے ہیں
ہم تو سائے سے بھی محبوب کو پہچانتے ہیں

پھول بچھ جاتے ہیں راہوں میں بصد عجز و نیاز
نقش پائے نگہ شوق کو پہچانتے ہیں

مسکراتے ہیں وہ منھ پھیر کے محفل میں کبھی
گھنی پلکوں سے نگاہوں کو کبھی چھانتے ہیں

دکنی رنگ وزباں پر کوئی ہنستا ہے، ہنسے
ایسی باتوں کا غیاث آپ برا ملنتے ہیں

غزل



ہیں سبک ذہین و سبک دست زمانے والے
رات کی رات میں دیوار اُٹھانے والے

ایک کانٹا تو ہوالفاظ کے گلدستے میں
کچھ حقیقت بھی ہوافسانہ سنانے والے

فرش گل ، وذق سبک گامی ، حقیقت ہیں مگر
دل نہ پامال ہو ، ہتذیب نچھانے وال

ہیں تنک آبی احساس سے پانی پانی
بوجھ احسان کا پلکوں پہ اٹھانے والے

آج کل شہر میں شعلوں کی حقیقت کیا ہے
کتنے آنسو ہیں غیاث آگ لگانے والے

غزل



تیری خاموشی میں طوفاں کبھی ساحل دیکھا
آج پلکوں پہ مگر سلسلۂ دل دیکھا

گھنے پیڑوں کی جٹاؤں میں مسافر الجھے
رینگتی راہوں میں کس نے مہ کامل دیکھا

جب بھی آنچ کسی پر تو مری جان لٹی
کون بینا ہے یہاں کس نے مرا دل دیکھا

اشک میں خون تبسم تھا، خموشی میں سوال
دل کی آنکھوں نے تو ہونٹوں میں بھی سائل دیکھا

جس جگہ ارض و سما جھک کے گلے ملتے ہیں
سرخ انگارہ پگھلتا ہوا اک دل دیکھا

رک گئے میرے قدم دل کے سفینے کی طرح
روکنے والے کی آنکھوں میں بھی ساحل دیکھا

غزل



بدلا علامتوں کو نئے انتقام نے
ماتھے کے بل دکھائے کسی کے سلام نے

دولت کی سمت دل تو جھکا رک گئے قدم
مالک کو قتل کردیا آخر غلام نے

آنکھوں کی آب ، زلف کے بھونرے ، حنا کی آنچ
سب پھیکے پڑ گئے ہیں تبسم کے سامنے

غزل



کوئی طوفان اُٹھائے ہے مرے کمرے میں
بن کے ساحل کوئی آئے ہے مرے کمرے میں

قہقہے کون لٹائے ہے مرے کمرے میں
درد ڈرتے ہوئے جائے ہے مرے کمرے میں

ہائے وہ شخص ، مرادوست ، وہ بے دست شراب
مجھ کو چھپ چھپ کے پلائے ہے مرے کمرے میں

جستجو غم کی اُسے لائی ہے شاید ، ورنہ
شخص پہلا ہے جو آئے ہے مرے کمرے میں

خیر مقدم کے لئے صاحب خانہ آئیں
موت یوں مجھ کو بلائے ہے مرے کمرے میں

جھک گئے شانے ، بدن ٹوٹے ہیں جانبازوں کے
دل وہی بوجھ اُٹھائے ہے مرے کمرے میں

۱۷۶

یہ تبسم ، یہ مہک پھولوں کی ، نغموں کا سرور
غم بھی کس وقت گھس آئے ہے مرے کمرے میں

جس کے انجام سے واقف ہنیں دنیا بھی غیاث
بن کے افسانہ وہ آئے ہے مرے کمرے میں

۱۷ جولائی ۱۹۹۰ء